علامہ اقبال: فکری جہات کا شاعر

ڈاکٹر محمد بہلول
492 First Floor, Gali Bahar Wali,
Chhatta Lal Miyan, Daryaganj,
New Delhi - 110002

ملخص

اقبال نے 16-17 برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اقبال کی شاعری، ان کے فن اور زبان و بیان پر ان کی طالب علمی کے زمانہ ہی میں اعتراضات ہونے لگے تھے۔ غالب کی طرح اقبال پر بھی جو ان العمری ہی سے اعتراضات کے سنگ گراں برسنے شروع ہو گئے تھے۔ غالب اور اقبال میں صرف یہی بات مشترک نہیں تھی بلکہ فکر و اظہار کی سطح پر دونوں کے اجتہادی میلانات، تراکیب و استعارہ کے معاملہ میں ان کے انقلاب آفریں اقدام بھی یکساں تھے۔

اقبال کی شاعری پر بہت سے لوگوں نے نکتہ چینیاں کیں۔ بعض حضرات نے انھیں ناظم اور خطیب کہہ کر ان کے تمام تر شاعرانہ اوصاف پر پانی پھیر دینے کی بھی کوششیں کیں۔ ایسی معاندانہ مخالفتوں کا سبب ان کی وہ بے مثال اٹھان تھی جس نے پوری مملکت شعر میں ایک نوع کا انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس اٹھان میں موضوعات کی جدت اور رنگا رنگی، فکری اور نظری اجتہاد، زبان اور محاورے کا جدلیاتی استعمال اور گھسی پٹی رعایت لفظی سے انکار اور ایک نئی شعری کائنات اور مختلف معنوی جہات کی دریافت و جستجو کا جذبہ کارفرما تھا جو عربی اور فارسی کے لوازم شعری کا اتباع کرنے والے مشاہیر کو کسی طرح گوارہ نہیں تھا۔

علامہ اقبال: فکری جہات کا شاعر

ہیرا نند سوز نے ''ارتکاز'' کے سالنامہ 1996 میں لکھا تھا کہ ''شیکسپیئر کا مقام متعین کرنے میں چار سو سال کی بحثوں کا عمل دخل ہے۔ غالب کی اہمیت کو ایک صدی کی تنقیدی کوششوں کے بعد سمجھا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا قول ہے کہ ''غالب کے تبحر علمی کا چرچا تو ابتدا ہی سے ہونے لگا تھا۔ وہ عربی اور فارسی کے مستند استاد تھے۔'' اور سجاد نقوی نے مختصر سے جملے میں ایک اہم بات کہی کہ ''غالب اب زندہ و جاوید ہو چکے ہیں۔'' غالب ہی کی طرح اقبال بھی عربی اور فارسی زبان پر مکمل دسترس رکھتے تھے، وسیع المطالعہ تھے اور ان کے تبحر علمی اور بے پناہ ذہانت کے چرچے ان کی طالب علمی کے زمانے میں ہونے لگے تھے۔ انھوں نے اسکول میں پڑھنے کے دوران ہی موزوں اور بامعنی شعر کہنے شروع کر دیے تھے اور مقامی مشاعروں میں شرکت بھی کرنے لگے تھے۔ اپنی کم سنی ہی میں وہ اپنے شہر میں بطور شاعر متعارف ہو گئے تھے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ابتدائی دور ہی میں ان کی شخصیت نے فن میں اپنی رونمائی کر دی تھی اور ان کے اندر پوشیدہ کائنات کے ابواب نے ورق ورق کھلنا شروع کر دیا تھا۔ پنجاب میں لاہور ادب اور صحافت کا مرکز رہا ہے مگر پنجاب کو دبستان کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا پنجاب کے مختلف شہروں میں اور خصوصیت سے لاہور میں اپنے اپنے دبستان کی ترجمانی کرتے تھے مگر اس کم عمری میں بھی اقبال کا شعور اتنا بالغ تھا کہ انھوں نے دبستانی بدعت کو قبول نہیں کیا اور اپنے آپ میں ایک دبستان نو کی تشکیل شروع کر دی۔ اس کی توثیق اکبر حیدری کے اس قول سے ہو جائے گی:

''لاہور میں بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں انجمن مشاعرہ کا ڈول ڈالا گیا۔ مجلس شاعری حکیم امین الدین (جن کے نام پر بازار مشہور ہے) کے گھر پر ہوتی تھی۔ میر مجلس اسی خاندان کے بزرگ حکیم شجاع الدین صاحب تھے۔ مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظم حسین ناظم لکھنوی مشاعرے کے روح رواں تھے اور اپنے اپنے دبستان کی ترجمانی کرتے تھے۔ اقبال اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ مشاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مقطع یہ ہے

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے

1894 کی یہ غزل پہلی مرتبہ شیخ عبدالقادر نے اقبال کے سوانح حیات اور فوٹو کے ساتھ نوبت رائے نظر کے رسالہ ''خدنگ نظر'' لکھنؤ مئی 1902 میں شائع کرائی تھی۔ غزل کا مقطع اقبال کے نظریہ زبان کا آئینہ دار ہے اور وہ اس پر آخری عمر تک عمل پیرا رہے۔ وہ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے قائل نہیں تھے اور اپنے آپ کو دہلی اور لکھنؤ کے ادبی جھگڑوں سے بالاتر رکھ کر شاعری کے ذریعہ سے جدت مضامین کی ایک علاحدہ کائنات قائم کرنا چاہتے تھے زبان کے متعلق ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

نہ یہ دلی کی اردو ہے نہ یہ پورب کی بولی ہے
زباں میری ہے اے اقبال بولی دردمندوں کی

جب ان کی زبان پر اعتراضات ہونے لگے تو واشگاف الفاظ میں اعلان کیا ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

(اقبال کا نظریہ فن: اقبالیات، ص 40)

اکبر حیدری کے اس اقتباس میں دو تین باتیں اہم ہیں، جن پر اختصار کے ساتھ گفتگو ضروری ہے۔ ان کے قول کے مطابق 1894 کی غزل شیخ عبدالقادر نے ''خدنگ نظر'' ماہ مئی 1902 میں اپنے خصوصی نوٹ کے ساتھ شائع کرائی تھی۔ یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ اقبال کی غزل انھوں نے 1902 میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی یا اس سے قبل۔ ان کے الفاظ ''پہلی مرتبہ'' بھی متوجہ کرتے ہیں کیونکہ شیخ عبدالقادر نے ''بانگ درا'' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''میں نے ادب اردو کی ترقی کے لیے رسالہ ''مخزن'' جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اثنا میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ اس رسالہ کے ''حصہ نظم'' کے لیے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا کہ میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی۔ انھوں نے کہا ''ابھی کوئی نظم تیار نہیں'' میں نے کہا ''ہمالہ'' والی نظم دے دیجیے اور دوسرے مہینے کے لیے کوئی اور لکھیے۔ انھوں نے اس نظم کو دینے میں پس وپیش کیا کیونکہ انھیں خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں مگر میں دیکھ چکا تھا

کہ وہ بہت مقبول ہوئی۔اس لیے میں نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی اور ''مخزن'' کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل 1901 میں نکلا، شائع کردی۔ یہاں سے گویا اقبال کی اردو شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا۔''

شیخ عبدالقادر کے اس بیان کے مطابق سب سے پہلے اقبال کی نظم ''ہمالہ'' شائع ہوئی اور ان کی غزل بعد میں مگر ماہ فروری 1894 ہی میں اقبال کی ایک غزل ماہنامہ ''زبان'' دہلی میں شائع ہوچکی تھی۔ اکبر حیدری نے اپنے مضمون میں دوسری اہم بات یہ لکھی ہے کہ اقبال نے شروع ہی سے اپنے آپ کو دہلی اور لکھنؤ کے ادبی جھگڑوں سے الگ رکھا تھا اور زبان واظہار کے بندھے ٹکے اصولوں اور شعر گوئی کے قدیم رسمی تقاضوں کی پیروی ضروری نہیں سمجھی تھی۔ انھوں نے زبان ومحاورہ اور روز مرہ کے ساتھ ساتھ شعری اصطلاحات ''ترکیب سازی اور فکروخیال کی شیرازہ بندی کے معاملے میں بھی آزادانہ رویہ اختیار کیا جو دبستان دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ فن کی نظر میں سخت ناگوار اور قابل اعتراض تھا۔ غالب کی طرح اقبال پر بھی جوان العمری ہی سے اعتراضات کے سنگ گراں برسنے شروع ہوگئے تھے۔ غالب اور اقبال میں صرف یہی بات مشترک نہیں تھی بلکہ فکر و اظہار کی سطح پر دونوں کے اجتہادی میلانات، تراکیب واستعارہ کے معاملہ میں ان کے انقلاب آفریں اقدام بھی یکساں تھے۔اس زمانہ میں غالب کے ''سیلاب بلا'' یا ''گنجینہ معنی کے طلسم'' اور اقبال کی ''نوائے پریشاں'' اور ''از درون میخانہ'' کی امیجریز بھلا کتنے لوگ قبول کرسکتے تھے۔ ہاں، اگر کچھ فرق تھا تو یہ کہ غالب کے یہاں اپنی ستائش اور ایک نوع کی تعلّی کی بہتات ہے تو اقبال کے یہاں انکساری اور عاجزی کا احساس نمایاں ہے۔ غالب اور اقبال دونوں اردو کے بڑے دانشور شاعر تھے۔ دونوں مجتہد تھے اور دونوں نے ہی اختلاف وانحراف کا شکار ہوئے۔ بقول شیخ عبدالقادر:

> ''غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ پھر جسد خاکی میں جلوہ افروز ہوا کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال کا نام پایا۔''

غالب کی شاعری پر اعتراضات ان کی زندگی میں بھی ہوئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مظہر امام نے لکھا ہے کہ ''غالب کے بارے میں جب میں سوچتا ہوں تو مجھے سرکس کے اس مسخرے کا خیال آتا ہے جو اپنا سوانگ بدل بدل کر اور عجیب وغریب حرکتیں کر کے دوسروں کو ہنسانے یا دوسروں کی توجہ اپنی جانب راغب کرانے کی کوشش کرتا ہے۔'' غالب نہ صرف اردو ادب بلکہ عالمی ادب میں زندہ جاوید ہو چکے ہیں۔ ولادت کے لحاظ سے تقریباً ایک سو پچیس برس مگر عمر شاعری کے لحاظ سے اقبال نے بھی ایک صدی پوری کر لی ہے۔ غالب نے 13-14 سال کی عمر میں معیاری اور چونکانے والی غزلیں کہنی شروع کر دی تھیں لہٰذا وہ شک وشبہ کے دائرے میں بھی آئے۔ اقبال نے 16-17 برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اقبال کی شاعری، ان کے فن اور زبان و بیان پر ان کی طالب علمی کے زمانہ ہی میں اعتراضات شروع ہو گئے تھے۔ اسی ضمن میں محمد بدیع الزماں رقم طراز ہیں کہ:

> ''اقبال کے کلام پر اعتراضات کی شدت ان کی زندگی کے ہر دور میں رہی مگر ہر دور میں سب سے زیادہ حملے ان کے فن پر ہوا کیے۔ اس لیے نقادان ادب نے اردو شعرا کے کلام کی قدر و قیمت کو پرکھنے اور تولنے کا جو ایک بندھا ٹکا اصول مرتب کر رکھا تھا، جو آج بھی قائم ہے اور جس پر مغرب کی تنقید نگاری کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ ان اصولوں کے مطابق اقبال کا کلام، ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا، اس لیے انھوں نے ان کے کلام پر طرح طرح کے اعتراضات کیے۔'' (عمل سے زندگی بنتی ہے، ص 164)

اقبال کے فن اور زبان پر اعتراضات کی بوچھار اس زمانہ میں شروع ہو گئی تھی جب وہ دنیائے شعر میں نووارد ہی نہیں، نوآموز بھی تھے اور ان کی عمر زیادہ سے زیادہ 23 - 24 سال تھی۔ 1894 سے 1902 کے دوران ان کی ایسی نظمیں اس عہد کے معیاری اور مقتدر رسائل میں شائع ہوتی رہیں، جو موضوع، مواد اور اسلوب کے لحاظ سے پرکشش، نئی اور متاثر کن تھیں۔ نتیجتاً اقبال ادب پسند قارئین اور وسیع النظر علمائے ادب وشعر کے چہیتے بن گئے۔ دراصل یہی بات اساتذہ فن اور بعض انشا پردازوں کو گراں گزری کہ انتہائی قلیل مدت میں مٹھی بھر نظمیں لکھ کر اقبال نے بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی تھی اور پورے ہندوستان میں ان کی مدح سرائی ہونے لگی تھی۔ یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ مغرب کی

تنقیدی معیار پر ان کے کلام کو پرکھا گیا اور ان کے شعر وفن پر اوچھے وار کیے گئے کیونکہ اس وقت تک (جب اعتراضات کی ابتدا ہوئی تھی) انگریزی طرز تنقید اور نظریہ سازی کے طور طریقوں سے بہت کم لوگ واقف تھے شاعری لفظی بازی گری اور قافیہ بندیوں کی اسیر تھی خصوصا لکھنوی شعرا مشکل قوافی اور ردیفوں میں شعر گڑھنے کو معراج فن سمجھتے تھے۔ وہ لوگ خود کو اہل زبان میں شامل کرتے تھے اور اہل پنجاب کو خاطر میں لاتے تھے۔ اقبال چونکہ پنجابی تھے لہٰذا لکھنوی دبستان کے بیشتر ارباب فن نے انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا اور ان کے شعر وفن پر سخت نکتہ چینی کی۔ اقبال نے شوکت حسین کے نام تحریر کردہ اپنے 6 جنوری 1919 کے خط میں لکھا تھا کہ ''لکھنوی ناقدوں کو ابھی فنی تنقید کے اصولوں کو سیکھنے کی ضرورت ہے۔'' خواجہ احمد فاروقی نے اس جانب واضح اشارہ کیا ہے:

> ''اکبر اور حسن نظامی کی متصوفانہ مخالفت میں ایک دبی ہوئی چنگاری اس احساس کی بھی تھی کہ اقبال اہل زبان نہیں ہیں۔''

ایسی ہی ایک دبی ہوئی چنگاری کی نشاندہی شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب کی فارسی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں بڑی چالاکی سے آل احمد سرور کے حوالے سے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''شبلی اور غالب کے مقابلے میں ہم اہل لکھنؤ اور اقبال کو پیش کر سکتے ہیں کہ لکھنؤ والوں (بلکہ عام اردو والوں) کو اقبال کو مستند ماننے میں ہمیشہ تامل رہا ہے۔ سرور صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک بار لکھنؤ میں بحث اٹھی تھی کہ ''آویزش'' بمعنی جھگڑا۔ اختلاف صحیح ہے کہ نہیں۔ سرور صاحب نے فوراً اقبال کا شعر پڑھا۔
>
> تا کجا آویزش دین وطن
> جوہر جاں پر مقدم ہے بدن
>
> تو سراج لکھنوی مرحوم نے فرمایا کہ اقبال مستند نہیں، کسی اہل زبان کا شعر سنایئے۔''

(اوراق، لاہور، سالنامہ 1997، ص 25)

اقبال کے کلام پر سب سے پہلے 1902 میں کڑی تنقید بلکہ نکتہ چینی ہوئی جو ''تاج الاخبار'' راولپنڈی میں چھپی۔ جس کا فاضلانہ منطقی جواب ''فولاد'' کے نام سے کسی ادبی شخصیت نے لکھا۔ اس اخبار

میں اس سال کسی صاحب نظر روایت پسند انشا پرداز نے اپنی شخصیت کو پوشیدہ رکھ کر ''تنقید ہمدرد'' کے نام سے اقبال کے شعر وفن پر بے تحاشہ اعتراضات کیے۔ اقبال کی مدافعت میں جوابی مضمون میر غلام بھیک نیرنگ نے انبالوی کے نام سے لکھا۔ یہ ادبی نوک جھونک اقبال کے حق میں مفید ثابت ہوئی مگر وقت کے ساتھ ساتھ اقبال کے فن اور زبان پر اعتراضات کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ محمد بدیع الزماں نے لکھا ہے کہ:

> ''ابھی یہ آگ سلگ رہی تھی کہ حسرت موہانی آتشیں اسلحوں کے ساتھ اقبال کے زبان و بیان کے خلاف میدان میں کود پڑے۔''

اس جنگ میں چکبست نے بھی حسرت کا ساتھ دیا۔ خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی نے پورے ملک میں اقبال کے خلاف محاذ قائم کیا۔ علامہ سیماب اکبر آبادی نے بھی اپنے معروف جریدہ ''شاعر'' میں کئی مضامین شائع کیے اور اقبال کی زبان، محاورہ، ترکیب سازی اور عروضی خامیوں کی نشاندہی کی۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل میں اغلاط'' کے زیر عنوان ایک باب لکھا۔ اکبر حیدری نے انھیں بے جا اعتراضات قرار دیا اور اثر لکھنوی نے چوبیس اعتراضات کو صریحاً غلط ٹھہرایا اور مدلل جواب لکھا۔ ماضی قریب کے نامور نقاد کلیم الدین احمد تو گویا ہاتھ دھو کر اقبال کے پیچھے پڑ گئے۔ انھوں نے ''اقبال ایک مطالعہ'' میں جگہ جگہ اقبال کا مذاق اڑایا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''اقبال کا کلام خطابت ہے، پیغام ہے، شاعری نہیں۔'' احسان دانش نے تو یہ لکھ کر سارے معترضین کو پیچھے چھوڑ دیا کہ ''اقبال شاعر نہیں ناظم ہے۔'' ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد ماہرین اقبال میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے قول کے مطابق کلام اقبال کی نکتہ چینی کرنے والوں میں پیارے صاحب رشید، مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری بھی پیش پیش رہے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اقبال جس اٹھان کے ساتھ اردو شاعری میں نمودار ہوئے اس کی دوسری مثال شاید ہماری شاعری میں نہ مل سکے۔ شاعرانہ اعتبار سے وہ شروع ہی میں متنازعہ فیہ شخصیت بن گئے۔ پیارے صاحب رشید کو ان کی اردو عجیب وغریب بلکہ فارسی نظر آئی۔ دہلی اور لکھنؤ کے بعض اہل زبان نے انھیں زبان سے ناآشنا قرار دیا۔ مجنوں صاحب اور فراق صاحب کو ان میں حجازی کے قابل اعتراض حد تک بلند نظر آئی لیکن یہ کہ اقبال کی شاعری، شاعری نہیں خطابت ہے۔ اس

بات کو منطقی حدوں تک لے جانے کا سہرا پروفیسر کلیم الدین احمد کے سر ہے۔ اکثر نئے اہل قلم اس قسم کی آرا سے متاثر ضرور ہوئے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اقبال کی شاعری محض واقعات کا بیان ہے اور شاعرانہ تڑپ سے خالی ہے۔ سچدانند سنہا نے اپنی انگریزی کتاب ''اقبال'' میں ان کی شاعری سے متعلق لکھا ہے کہ یہ شاعری غیر سرور آگیں ہے اور متناسب ترنم سے عاری ہے۔ سید عبداللطیف نے حالی کو اقبال سے بہتر شاعر قرار دیا تھا اور اس کی یہ وجہ بیان کی تھی کہ جہاں تک سادگی، صفائی بیان، دل ربائی اور رعنائی، انتخاب الفاظ اور بندش کے حسن کا تعلق ہے اقبال کی شاعری حالی کی شاعری کے معیار تک نہیں پہنچ سکتی۔''

(ماہنامہ ''شاعر'' اقبال نمبر 1988)

اس قسم کی نکتہ چینیاں اقبال کی زندگی میں بھی بہت ہوئیں۔ کسی نے زبان کے نقائص بیان کیے، کسی نے ترکیب واستعارہ میں کیڑے نکالے، کسی نے فنی معائب کی نشاندہی کی اور بعض حضرات نے انھیں ناظم اور خطیب کہہ کر ان کے تمام تر شاعرانہ اوصاف پر پانی پھیر دینے کی بھی کوششیں کیں۔ ایسی معاندانہ مخالفتوں کا سبب ان کی وہ بے مثال اٹھان تھی جس نے پوری مملکت شعر میں ایک نوع کا انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس اٹھان میں موضوعات کی جدت اور رنگا رنگی، فکری اور نظری اجتہاد، زبان اور محاورے کا جدلیاتی استعمال اور گھسی پٹی رعایت لفظی سے انکار اور ایک نئی شعری کائنات اور مختلف معنوی جہات کی دریافت وجستجو کا جذبہ کارفرما تھا جو عربی اور فارسی کے لوازم شعری کا اتباع کرنے والے مشاہیر کو کسی طرح گوارہ نہیں تھا۔ اقبال نے کبھی اپنے معترضین کی کوئی خاص پروا نہیں کی۔ انھوں نے نہ تو کبھی غم وغصہ کا اظہار کیا اور وضاحتی یا جوابی مضامین لکھنے کی ضرورت سمجھی۔ اپنے قدردانوں کی ایما پر کبھی کبھی انتہائی انکسارانہ لب ولہجہ میں کچھ اس طرح کی باتیں لکھیں:

1 ''بہر حال نظم کی خامیاں نفسیاتی ہیں اور بعض مقامات پر خامیوں کا تعلق اظہار بیان سے ہے۔''

(خطوط اقبال، ص 134)

2 میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا، اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں، بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن

کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات اور روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مرد فردوست
کہ بر من تہمت شعروسخن بست

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے اقبال کے جذبہ عجز وانکسار پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''اقبال نے ازرہ انکسار خود کو شاعر نہ کہا ہو لیکن شاعر کا رتبہ ان کے نزدیک معاشرتی زاویے سے بے حد بلند اور اہم ہے۔ اور یہ کہنا تو خیر نہیں ہے کہ اقبال نے اردو شاعری کی روایات سے یکسر بغاوت کی، تاہم اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے اجتہاد سے کام لیا اور اس اجتہاد میں بھی اتنی احتیاط برتی اور ایسا اہتمام کیا کہ ہماری شاعری کی خوبیوں اور مثبت پہلوؤں کو نہ صرف اپنایا بلکہ انھیں فروغ دینے کی سعی بھی کی۔''

(ماہنامہ ''شاعر'' اقبال نمبر 1988)

واقعی اقبال نے اپنے آپ کو شاعر تسلیم نہ کر کے انکساری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ حقیقتاً وہ شعروفن پر نہ صرف خلاقانہ دسترس رکھتے تھے بلکہ شاعری کے رموز وعلائم سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ شاعرانہ مزاج اور وجدانی کیفیات انھیں فطرت کی جانب سے ودیعت ہوئی تھیں اور ناقدانہ بصیرت ان کی علمی اور فکری صلاحیتوں کی دین تھی۔ انھوں نے شاعری اور اس کے رتبے سے متعلق جابجا اظہار خیال کیا ہے اور اس سچائی کو بھی تسلیم کیا ہے کہ شعر ان پر ''نازل'' ہوتے تھے اور ''آیات'' کی طرح ''حفظ'' ہو جایا کرتے تھے۔

اقبال کی زندگی میں بھی ان کے قدردانوں اور ان کے علم وفن کے پرستاروں کی کمی نہیں تھی۔ شیخ عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، اثر لکھنوی اور ابوالکلام آزاد جیسے دانشوران ادب بھی ان کے نئے شعری رویہ اور نئی فکری اپج کے معترف تھے۔ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

''زبان کے لحاظ سے ڈاکٹر اقبال کو ان شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی

خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروانہیں کرتے لیکن حق یہ ہے کہ اس ایک لغزش مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں۔''(''معارف''اعظم گڑھ جلد دوم، اپریل1918)

موجودہ عہد میں اقبال کے شیدائیوں، مداحوں اور معتقدوں کی اتنی زیادہ تعداد ہے کہ صرف ان کے نام اور کام کی فہرست تیار کی جائے تو ایک بھاری بھرکم کتاب تیار ہوجائے گی۔ بلاشبہ برصغیر میں ان کے رجحانات، افکار، فلسفہ حیات اور شاعرانہ عظمت پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور بے شمار معیاری، جریدوں کے خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان میں اقبال پر قابل ذکر کام کرنے والوں میں ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر ظ انصاری، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالحق، مولوی عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر عبدالمغنی، سردار جعفری اور محمد بدیع الزماں وغیرہ کے علاوہ پروفیسر آل احمد سرور بھی ہیں۔انھوں نے اقبال پر ہونے والے اعتراضات اور ان کے فکر وفن پر کم سے کم الفاظ میں بڑی جامع باتیں کہی ہیں۔ملاحظہ ہوں:

''اب بھی ایسے اشخاص موجود ہیں جو اعلانیہ نہیں تو چھپے دبے ضرور اقبال کی زبان پر اعتراضات کرتے ہیں۔وہ ترکیب غلط ہے۔اس محاورے کو صحت کے ساتھ نظم نہیں کیا۔ یہ مونث نہیں مذکر ہے۔ یہاں تعقید معنوی پائی جاتی ہے۔ غالب و اقبال کی ترکیبیں ادب وانشا کی چمن ہیں۔ان کی حیثیت دیا سلائی کی ہے جس سے پڑھنے والوں کو آتش بازی چھوٹتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اقبال اور غالب کا کام تو قواعد کی پابندی نہیں۔گریمر کا کام ہے کہ ان اشخاص کی مقرر کردہ شاہراہوں پر چلے اور ان کے طرز کو دیکھ کر اپنے قوانین مرتب کرے۔'' (نئے اور پرانے چراغ)

''اقبال دراصل کوہ ہمالہ کی طرح ہے۔ ہمالہ کا تاج صرف ایورسٹ نہیں ہے بلکہ اس میں ''کنچن چنگا'' کے ٹونگا پربت!''نندا دیوی''ایسی بہت سی چوٹیاں ہیں اور ہر چوٹی کا الگ الگ حسن اور الگ عظمت ہے۔''

(اقبالیات''اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر، شمارہ1، 1981)

سطور بالا میں شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک مضمون کا اقتباس بطور حوالہ نقل کر چکا ہوں۔ اس میں بھی اہل زبان نہ ہونے کی بات ''دبے چھپے'' اعتراض کے مصداق ہے۔ اقبال تو پھر بھی نہ صرف زبان آشنا تھے بلکہ ندرت فن اور معنی کی ترسیل وابلاغ کی مختلف جہات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اعلیٰ وادنیٰ، بلند و کمتر اور بامعنی ومہمل کلام میں امتیاز کرنے کا درک رکھتے تھے مگر فاروقی صاحب کی شعرفہمی اور زبان دانی ہمیشہ مشکوک رہی ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ''ایسا نہیں ہے کہ ہم سب بالکل صحیح اور عمدہ زبان لکھتے ہیں۔ یہ کمبخت چیز ہی ایسی ہے کہ بڑے بڑے دھوکا کھا جاتے ہیں۔'' شمس الرحمٰن فاروقی اس حقیقت سے بھی انکار کرتے ہیں کہ اقبال کا عالمی ادب میں بہت اونچا مقام ہے انھوں نے ایک صریحاً غلط بات لکھی ہے۔

اقبال کی فکر اور نظریہ حیات پر بھی بعض نقادوں نے انتہائی لچر اوچھے اعتراضات کر کے ان کی حب الوطنی اور فلسفہ زندگی کو غلط ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے۔ ان میں فراق اور تاراچرن رستوگی پیش پیش رہے ہیں فراق کا ایک بچکانہ قسم کا اعتراض یہ بھی تھا کہ اقبال نے ابتدا میں ہندوستان کو ''سارے جہاں سے اچھا'' قرار دیا اور بعد میں اپنے قول سے گھبرا کر انھوں نے ''چین وعرب ہمارا'' اور ''سارا جہاں ہمارا'' وغیرہ کہا۔ اقبال کی دونوں باتیں ان کے نظریے اور فلسفے کے عین مطابق ہیں۔ ترانہ ہندی کا مطلع اس تناظر میں ہے کہ تم جہاں بھی سکونت پذیر رہو اس سرزمین (وطن) کے لیے اپنا جان مال سب کچھ نثار کر دو۔ بعد میں جو شعر انھوں نے خلق کیا اس کا پس منظر یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اس کو ملائک پر بھی فضیلت حاصل ہے اور پوری کائنات اس کی وراثت ہے۔ قرآن کی نظر میں انسان عظیم ہے اور کائنات حقیر جبکہ فراق کا مذہبی نصب العین بالکل اس کے برعکس ہے۔ کاش انھوں نے اعتراض کرنے سے پہلے ان نکات پر غور وخوض کر لیا ہوتا!

تاراچرن رستوگی اقبال کی ڈائری کے بعض فقروں کو لے اڑے اور ان کی حب الوطنی اور جذبہ وطنیت پر دھاوا بول دیا جبکہ پرستش صرف خدا کی ہوتی ہے۔ کسی اور شئے کی نہیں۔!

علامہ اقبال کے ناقدین ومعترضین کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہمیشہ کسی تخلیقیت شعار فن کار کے تخلیقی اسرار، فکری عوامل اور زاویہ نظر کو سمجھنے کے لیے، اس کے لفظوں، اشاروں اور کنایوں کی مختلف صورتوں میں پوشیدہ ان آفاقی اور ماورائی قدروں کی بسیط کائنات کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے، جو تہ در تہ

ہوتی ہیں اوران کی نقاب کشائی اس وقت ممکن ہوتی ہے جب شارح یا ناقد یا مفکر تخلیق کار کے کرب کو مس کرتا ہے، اس کے عرفان وادراک سے ہم رشتگی پیدا کرتا ہے اوراس کی وجدانی کیفیات اورفکری اعجاز کی گزرگاہوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ ہر تخلیق کار کی اپنی ایک بسیط کائنات اور منفرد شخصیت وفن ہوتی ہے جو سخت سے سخت حصار نقد کو توڑ کر اپنا امیج خود بناتی ہے اور اپنی انفرادی شناخت کا ادراک کرتی ہے۔ علامہ اقبال ایسے ہی بڑے دانشور شاعر ہیں جنھیں کبھی کوئی نیچا نہیں دکھا سکا اور انھوں نے انتہائی شان بے نیازی سے کامیابی وکامرانی کی منزلیں طے کیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ ان کی بلند قامتی کو کبھی کوتاہ ناقدین کوئی زک نہیں پہنچا سکے۔

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو

☆☆☆